فیض کا ایک گمنام منظوم اردو ترجمہ: ''دیا''

ڈاکٹر عمران ظفر☆

Abstract:

"Faiz Ahmad Faiz also translated poetry of the poets of different languages and transformed them into URDU Poetry. Among them some of the Faiz`s poems have not come into the limelight. The following poem DEA written by a Baloachi poet Mir Gul Khan is also a poetic translation that was unknown to date.

فیض احمد فیض نے اپنی اردو شاعری میں ایسے شعرا کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ بھی کیا ہے جن کے ساتھ ان کی نظریاتی ہم آہنگی تھی یا پھر وہ شعرا فیض کے ہم عصر اور دوست تھے۔ چنانچہ فیض نے داغستان کے ملک الشعرا رسول حمزہ، ترکی کے معروف شاعر ناظم حکمت اور قازقستان کے ممتاز شاعر اولجر عمر علی سلیمان کی بعض نظموں کا منظوم اردو ترجمہ کیا جو 'شام شہر یاراں' اور 'غبار ایام' میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ فیض نے علامہ اقبال کے فارسی مجموعہ کلام 'پیام مشرق' کے قطعات، غزلیات اور منظومات سے انتخاب کر کے منظوم اردو ترجمہ کیا۔

ناقدین و محققین فیض نے فیض کے تراجم پر گراں قدر تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں اور ان کی تخلیقی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ تاہم فیض کے گم شدہ کلام کی تلاش میں قابل ذکر کوشش نہیں کی گئی۔ جس کے نتیجے میں تا حال فیض احمد فیض کا کچھ کلام گمنامی کی دھول میں لپٹا ہوا ہے۔ اسی طرح ان کے کیے ہوئے بعض منظوم تراجم جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آ سکے، توجہ کے طالب ہیں۔ آئندہ صفحات میں اسی حوالے سے فیض کی ایک گم شدہ نظم ''دیا'' کا سراغ لگایا گیا ہے جو بلوچی شاعر میر گل خان نصیر کی نظم ''ڈیوا'' کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔

ملک الشعراء بلوچستان، میر گل خان نصیر ۱۴ مئی ۱۹۱۴ء کو نوشکی کے ایک گاؤں ''کلی مینگل'' میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر حبیب خان بلوچستان کے معروف قبیلہ کے ذیلی طائفہ 'ڈگر مینگل' کے ''پائندہ زئی'' قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ میر حبیب کے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ میر گل خان نصیر ساتویں نمبر پر تھے جب کہ بھائیوں میں ان کا چوتھا نمبر تھا۔ ان کی والدہ ''بی بی حوراں'' رخشانی قبیلہ کے ''بولازئی'' خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔(۱) میر گل خان نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی کے سکول سے حاصل کی جب کہ دسویں کا امتحان گورنمنٹ سنڈیمن ہائی سکول کوئٹہ سے پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے انھوں نے لاہور کا رخ کیا، جہاں انھوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ

☆*ڈاکٹر عمران ظفر، استاد شعبہء اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج ۱۷۰ جھنگ

لیا۔فرسٹ ائیر کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب وہ سیکنڈ ائیر میں پڑھ رہے تھے تو ایک دن اُن کی آنکھ میں کوئلہ پڑنے کے باعث تکلیف بڑھ گئی جس کے نتیجے میں انھیں تعلیم کا سلسلہ ادھورا چھوڑنا پڑا اور وہ واپس کوئٹہ آ گئے۔یہ زمانہ تقریباً ۳۲-۱۹۳۱ء کا تھا۔(۲) کوئٹہ واپسی پر انھوں نے اپنی سیاسی وسماجی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا۔۱۹۳۲ء میں بلوچستان کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے ''لوکل مسلم ایسوسی ایشن'' کے نام سے کوئٹہ میں ایک انجمن قائم کی اور اس انجمن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔(۳) وہ آزادی سے قبل نہ صرف سیاست سے وابستہ رہے بلکہ انتظامی عہدوں مثلاً بطور کسٹم آفیسر، سیکریٹری جوڈیشل، نائب وزیر جھالاوان (ریاست قلات) پر بھی فائز رہے۔قیام پاکستان کے بعد بلوچستان کی مختلف سیاسی جماعتوں ''پاکستان نیشنل پارٹی''، ''نیشنل عوامی پارٹی''، ''نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی'' میں شمولیت اختیار کی اور بھرپور سیاسی کردار ادا کیا جب کہ ۱۹۷۸ء میں سیاست کو خیرباد کہا۔عمر کے آخری پانچ سال ادبی، ثقافتی اور تخلیقی سرگرمیوں میں گزارے اور ۶ دسمبر ۱۹۸۳ء میں وفات پائی۔(۴)

میر گل خان نصیر نے اسلامیہ کالج کے زمانے میں اردو شاعری کی۔(۵) اردو کے علاوہ وہ انگریزی میں شاعری کرتے تھے، جو کالج کے مجلوں میں چھپتی تھی (۶) میر گل خان کالج کی طرف سے چھپنے والے ادبی مجلّہ ''کریسنٹ'' کے سب ایڈیٹر بھی رہے۔(۷) لاہور کی اس ادبی فضا نے میر گل خان نصیر کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔اردو شاعری کرتے ہوئے وہ اصلاحی ومقصدی شاعری کے قائل تھے چنانچہ اردو شاعری کے حوالے سے علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، مولانا الطاف حسین حالی اور یوسف ربی مگسی کی قومی شاعری سے متاثر تھے۔میر نصیر اپنے عہد کی رجحان ساز ترقی پسند تحریک سے بھی بہت متاثر تھے جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا:

> ''کچھ عرصہ علامہ اقبال سے متاثر رہا، مگر ادب کے حوالے سے میں نے سب سے زیادہ اثر ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک سے قبول کیا۔لیکن میرے خیال میں ایک شاعر جسے وطن اور قوم کا درد ہو سب سے زیادہ اثر اپنے اطراف میں پھیلے ہوئے لوگوں کی بدحالی، پسماندگی اور قومی جبر سے قبول کرتا ہے۔میری شاعری میں بھی بنیادی طور پر اپنے عوام کی مادی اور ذہنی پسماندگی اور ان سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کا عکس ہے۔''(۸)

میر گل خان نصیر نے ۱۹۳۳ء سے ۱۹۵۰ء تک کے عرصے میں اردو شاعری کے حوالے سے سینتالیس کے قریب نظمیں اور غزلیں لکھیں اس کے بعد اردو شاعری ترک کر دی تاہم ان کی بلوچی شاعری کا جو سلسلہ ۱۹۴۲ء میں شروع ہوا تھا وہ تمام عمر جاری وساری رہا۔(۹)

فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء) اور میر گل خان نصیر (۱۹۱۴ء) کی عمروں میں صرف تین سال کا تفاوت تھا۔دونوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور کا رخ کیا یہ الگ بات کہ میر گل خان نصیر زیادہ عرصہ لاہور میں تعلیم جاری نہ رکھ سکے تاہم ان کی شخصیت میں موجود شعر ادب کا شوق لاہور ادبی محفلوں کے زیر اثر پروان چڑھا۔فیض اور نصیر دونوں ترقی پسندانہ نظریات کے قائل تھے اور دونوں ہی نے ابتدائی طور پر مولانا حالی اور اقبال کی شاعری کے

اثرات قبول کیے۔فیض کی طرح میر گل خان نصیر بھی متعدد بار جیل گئے۔قید کے دوران ان سے بھی متاعِ لوح وقلم چھین لی گئی تو انھوں نے فیض کی طرح خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر شعر لکھے۔اپنی سیاسی زندگی (۱۹۳۹ء تا ۱۹۷۸ء) میں مجموعی طور پر پندرہ سال جیل میں رہے۔(۱۰) دونوں تخلیق کار صحافت کے میدان سے وابستہ رہے۔۱۹۶۲ء میں جب فیض کو سویت یونین کی طرف سے ''لینن امن انعام'' دینے کا فیصلہ کیا گیا تو میر گل خان نصیر کو بھی اس انعام کے لیے روس سے دعوت دی گئی لیکن میر گل خان کے صدر ایوب کے ساتھ تعلقات ناخوشگوار ہونے کے باعث انھیں ماسکو جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ (۱۱) فیض احمد فیض اور میر گل خان نصیر کی شخصیت کا جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے کہ دونوں میں قناعت پسندی، جرأت مندی، صاف گوئی، محنت پسند طبقے سے محبت، مزدوروں، محکوموں، کسانوں اور غریبوں کے لیے دردِ دل جیسے اوصاف موجود تھے۔

فکری مماثلتوں کے حوالے سے فیض اور میر گل خان نصیر کی شاعری کے بنیادی موضوعات میں بھی کسی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ترقی پسند نظریات اور مارکسزم سے متاثر ہونے کے باعث عوام کے مسائل، ان کی آزادی، امن، عدل وانصاف، سرمایہ دارانہ استحصال اور حب الوطنی جیسے موضوعات کا یکساں ملتے ہیں۔میر گل خان نصیر کی ایک اردو نظم کا اقتباس ملاحظہ ہو:

کیسے مانوں

کیسے مانوں کہ مرا دیس بھی آزاد ہوا
جب کہ ہے نشہ حکومت کا وہی ساز وہی
کیسے مانوں کہ یہ اجڑا چمن آباد ہوا
جب کہ ہے زاغ و زغن کا پرواز وہی
کیسے مانوں کہ فرنگی کی حکومت نہ رہی
جب کہ ہے جرگہ و جرمانہ و تعزیر وہی
کیسے مانوں کہ غلامی کی مصیبت نہ رہی
بیڑیاں پاؤں میں اور ہاتھوں میں زنجیر وہی (۱۲)

میر گل خان نصیر کی نظم سے اقتباس کے بعد فیض کی اگست ۱۹۴۷ء کے موقع پر لکھی نظم ''صبحِ آزادی'' کی بالخصوص یہ سطریں

یہ داغ داغ اجالا ، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں ، جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہو گا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام
جگر کی آگ نظر کی امنگ ، دل کی جلن
کسی پہ چارہ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں(۱۳)

فیض اور نصیر کے ہاں ادب برائے ادب کا نظریہ شعر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے تاہم یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس کے باوجود دونوں شعری آہنگ پر توجہ دیتے ہیں اور شعر کو نعرہ نہیں بننے دیتے۔ فیض تا دمِ آخر اپنے مخصوص اندازِ شعر پر قائم رہے جب کہ نصیر کے ہاں انقلاب کی لے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ فیض اور میر گل خان نصیر کے اس شعری رویے اور ذہنی ہم آہنگی کے حوالے سے واحد بخش بزدار کا کہنا ہے:

"فیضؔ ریشمی لفظوں میں اس صورت حال کی عکاسی کرتے رہے۔ جب کہ نصیرؔ اور جالبؔ آتشیں لفظوں سے کام لیتے رہے۔ مگر ان سب کا آدرش ایک تھا۔ مطمحِ نظر اور درد ایک تھا۔"(۱۴)

فیض احمد فیض اور میر گل خان نصیر کے فکری قرب کی ایک اور مثال میر گل خان نصیر کا وہ شعری مجموعہ ہے جس کا عنوان "سیناني کیچگ ءَ" ہے۔ جو فیض کے شعری مجموعے "سرِ وادیِ سینا" کا بلوچی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ میر گل خان نصیر نے سنٹرل جیل حیدر آباد میں اسیری (۱۹۷۷ء) کے دوران شروع کیا جو ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس ترجمے کے حوالے سے میر گل خان نصیر کا کہنا ہے:

"جیل کے انھی دنوں میں مجھے فیض احمد فیض کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ان کے کلام نے مجھے رفتہ رفتہ ایسا محسور کیا اور میرے دل میں ایک ایسی امنگ پیدا کر دی جو کسی بھی شاعر کے دل کو جلا بخشتی اور گفتار کی لڑی میں پرونے پر مجبور کرتی ہے۔ فیض کے اشعار اور جیل کی تنہائی نے مجھے یہ ترغیب دی کہ فیض کے ساتھ روحانی طور پر ایک بلوچی کچہری میں "ھمنیاد" (ہم مجلس) ہونے کی صورت پیدا کروں۔ اس وقت ان کے اشعار کا

مجموعہ ''سر وادیٔ سینا'' میرے زیرِ مطالعہ تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس سے ہی ابتدا کروں۔''(۱۵)

اگرچہ فیض احمد فیض اور میر گل خان نصیر کی رسم وراہ اور ملاقاتوں کے ذکر کے حوالے سے یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ دونوں عظیم شاعر پہلی بار کب اور کہاں ملے تاہم مورخینِ میر گل خان نصیر نے ان کی سوانح عمری لکھتے ہوئے ایک دو ملاقاتوں کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اس کے برعکس فیض کے کسی بھی سوانح نگار نے اس حوالے سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ لال بخش رند، فیض احمد فیض اور میر گل خان نصیر کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ جبیں ہوٹل کراچی میں ازبک شاعر رسول حمزہ کے اعزاز میں دعوت تھی۔ فیض احمد فیض نے میر صاحب کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ وہ میرے گھر آئے اور ہم دونوں اکٹھے چلے گئے۔ انھیں معلوم نہیں تھا اس موقع پر ان سے شعر پڑھنے کی درخواست کی جائے گی۔ جس میز پر ہم دونوں بیٹھے تھے، اسی میز پر تھوڑی دیر بعد فیض نے سبط حسن کو بھی بٹھا دیا ہم تینوں باتوں میں مشغول تھے کہ کارروائی شروع ہوگئی۔ کچھ دیر بعد اچانک فیض صاحب نے میر صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''بلوچستان کا ہمارا دوست آج ہمارے درمیان موجود ہے۔ میں میر گل خان سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ سٹیج پر آ کر اپنا کلام سنائیں'' میر صاحب اپنا نام سن کر گھبرائے اور کہنے لگے۔ ''یار فیض صاحب نے میرے لیے مصیبت پیدا کر دی۔ نہ میرے پاس کوئی نوٹ بک ہے نہ کوئی شعر یاد ہے''۔ اب بڑی خراب صورت حال تھی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ غصے میں آ کر کہنے لگے ''یار ہنسنا بند کرو اور اگر تمہیں میرے کوئی شعر یاد ہوں تو جلد سے لکھ دو''۔ میں ان کے دو بہت مشہور انقلابی قطعے لکھ کر دیئے۔ پھر سٹیج پر گئے اور ترجمے کے ساتھ سنائے۔''(۱۶)

میر گل خان نصیر نے اپنی نظم 'ڈیورا'' ۶۰-۱۹۵۹ء کے قریب لکھی گئی۔ جب ۱۹۵۵ء میں حکومت کی ''ون یونٹ'' پالیسی کے تحت بلوچستان کی کچھ ریاستوں کو مغربی پاکستان کے صوبے میں شامل کر دیا گیا۔ تو ۱۹۵۸ء میں سکندر مرزا کے دورِ حکومت میں اپنے بلوچی بھائیوں کے حقوق کے لیے نواب نوروز خان نے صدائے احتجاج بلند کی۔ جس سے بلوچستان کے حالات کی بہتری کی امید نظر آنے لگی۔ یہ نظم نواب نوروز خان کو خراج تحسین کے طور پر پیش کی گئی جو میر گل خان کے دوسرے شعری مجموعے ''شپ گروک'' میں شامل ہے۔ جب کہ فیض نے اس کا اردو ترجمہ ۱۹۷۰ء کے قریب کیا۔ لال بخش رند نے میر گل خان نصیر کی نظم 'ڈیورا'' کے حوالے سے ایک واقعہ رقم کیا ہے جس سے اس نظم کے ترجمے کا پس منظر اور دونوں شاعر کے دل میں ایک دوجے کے لیے عقیدت اور احترام کا اندازہ بھی بخوبی لگایا سکتا

ہے:

"میر نصیر کی فیض احمد فیض سے بہت گہری دوستی تھی ---ذوالفقار علی بھٹو حکومت کے دور میں فیض احمد فیض "نیشنل کونسل آف دی آرٹس" کے سربراہ تھے۔ وہ کونسل کی ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے کوئٹہ آئے تھے ---میٹنگ کی کارروائی کے بعد فیض صاحب نے میر گل خان نصیر سے مخاطب ہو کر کہا "میں نے آپ کی نظم "ڈیوا" (دیا) کا ترجمہ کیا ہے مجھے اپنی کچھ اور نظمیں دیجیے تا کہ میں ان کو اردو میں منتقل کر سکوں۔ مجھے آپ کی نظم کا ترجمہ کر کے بہت خوشی ہوئی ہے کہ بلوچی میں ایسی بلند پایہ نظمیں موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اچھی نظموں سے غیر بلوچ قارئین بھی روشناس ہوں۔"

فیض صاحب کی اس بات پر انھوں نے انکساری سے جواب دیا:

"فیض صاحب، میری نظموں میں سادہ خیالات ہیں ان کو ترجمہ کرنے سے کیا ملے گا؟"

فیض صاحب نے نصیر کے اس خیال سے اختلاف کیا اور جب ہم باہر آئے تب بھی فیض صاحب نے میر گل خان نصیر سے یہی گزارش کی:

"مجھے اسلام آباد اپنی منتخب نظمیں ضرور بھجوانا تا کہ میں ان کا اردو زبان میں ترجمہ کر سکوں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میر صاحب نے نے اپنی نظمیں ترجمے کے لیے فیض صاحب کو نہیں بھجوائیں۔ یہ دراصل ان کی انکساری تھی۔" (۱۷)

فیض احمد فیض نے میر گل خان نصیر کی کسی اور نظم کا ترجمہ بھی کیا ہے یا نہیں یہ سوال ابھی تشنۂ تحقیق ہے۔ بلوچی نظم "ڈیوا" کے حوالے ان کے کیے ہوئے ترجمے پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

"ڈیوا"

بلاں بی سگہ لالانی
گلیں ڈیوا شھمالانی
۱ تن انگاشپ تہار ماہ اِنت
دو دیمی ھکل و ڈاھ اِنت
در و دوُر ءَ مُج سیاہ اِنت
نہ منزل پاش نے راہ اِنت
بلاں بی سگہ لالانی
گلیں ڈیوا شھمالانی

۲ سیاهی په گل و داب اِنت
کڑی لوگ ءَ دپ تاب اِنت
کُچکانی گب و گاب اِنت
کروس مں منھ ءَ واب اِنت
بلاں بی سگّه لالانی
گلیں ڈیوا شهمالانی

۳ پلیتائی بدل کمثان
دل بنداں کنائت مان
تیرا تیل ءِ بدل گیجان
وتی ارس و دل ءِ حوثان
بلاں بی سگّه لالانی
گلیں ڈیوا شهمالانی

٤ چه هور و گوات و اَچ توُپان
کناں ساهءِ تئی دیمپان
دل جان و سرو سامان
کُناں کلاں تئی قربان
بلاں بی سگّه لالانی
گلیں ڈیوا شهمالانی

٥ برے تاریکی ءَ ایوک
تئی نورءَ اِنت مئے دل سکّ
تیی گردمُچ بنت یک یک
گنوں شیدا چه درائیں تک
بلاں بی سگّه لالانی
گلیں ڈیوا شهمالانی

٦ بلاں بی تا گلیں استار
سحارانی بدنت دیدار
بینت ورنا یلیں بیدار

سراں لئیب تُکننت سینگار
بلاں بی سبکہ لالانی
گلیں ڈیوا شہمالانی
۷ بلاں بی دیر نہ اِنت بامگاہ
یلیں نی بیل بنت آگاہ
رواں بنت در کنپت بنگاہ
چہ دشت و کوہ و بُن جلگاہ
بلاں بی سبکہ لالانی
گلیں ڈیوا شہمالانی
۸ بلاں بی چّم شلیت گوں توء
جگر مر مر سُچیت گوں توء
نصیرؔ ئبدل بلیت گوں توء
سُچیت، گریئیت، تپیت گوں توء
بلاں بی سبکہ لالانی
گلیں ڈیوا شہمالانی (۱۸)

دیا

اے ہمدمِ شب! گریہ خون ناب سلامت
اے سرخ دیے تیری تب و تاب سلامت
۱ باقی ہے ابھی رات سیاہ رنگ فضا ہے
للکار عدو کی ، کہیں خطرے کی صدا ہے
ہر ایک طرف سایوں کا طوفان بپا ہے
رستے کا نشاں کوئی نہ منزل کا پتا ہے
اے ہمدمِ شب! گریہ خون ناب سلامت
اے سرخ دیے تیری تب و تاب سلامت
۲ ہیں محوِ طرب تیرگیء شب کے پرستار
اور نور کے فرزند مقید پس دیوار

اوجھل ہیں نگاہوں سے ابھی صبح کے آثار
بیدار ہیں سگ خفتہ ہیں مُرغانِ سُبک سار
اے ہمدمِ شب! گریہ خون ناب سلامت
اے سرخ دیے تیری تب و تاب سلامت

۳ بجھ جائیں فلیتے تو رگ جاں کا جلا لو
روغن کی کمی ہو تو مرے خون میں نہا لو
جیسی بھی ہے یہ دولت بیدار سنبھالو
ہم سوختہ جانو کی شب تار اُجالو
اے ہمدمِ شب! گریہ خون ناب سلامت
اے سرخ دیے تیری تب و تاب سلامت

۴ صر صر ہو کہ باراں ہو ترے نور کی خاطر
ہم تیرے نگہباں ہیں شب غم کے مسافر
ہر چند کہ دشوار ہے یہ راہ بظاہر
تیرے لیے حاضر ہے تن ، جان بھی حاضر
اے ہمدمِ شب! گریہ خون ناب سلامت
اے سرخ دیے تیری تب و تاب سلامت

۵ روشن ہے تری ضو سے ہی ویرانوں کی صورت
دل چاک جو پھرتے ہیں گریبانوں کی صورت
جو حق کے پرستار ہیں دیوانوں کی صورت
حلقے میں لیے ہیں تجھے پروانوں کی صورت
اے ہمدمِ شب! گریہ خون ناب سلامت
اے سرخ دیے تیری تب و تاب سلامت

۶ جب تک وہ بہادر سرِ میداں نہیں آتے
جو اپنے لہو سے ہیں فضاؤں کو سجاتے
اور اپنے رجز سے نہیں اک حشر اٹھاتے
جب تک سحرِ سرخ کی منزل نہیں پاتے
اے ہمدمِ شب! گریہ خون ناب سلامت

اے سرخ دیے تیری تب و تاب سلامت

۷ کچھ اور چمک، صبحِ چمن دُور نہیں ہے
بیداریِ ارباب وطن دُور نہیں ہے
تسخیر کوہستان و دمن دُور نہیں ہے
بربادیِ آثارِ کہن دُور نہیں ہے
اے ہمدمِ شب! گریہ خون ناب سلامت
اے سرخ دیے تیری تب و تاب سلامت

۸ ہے چشمِ نصیر آج درخشندہ بھی ، نم بھی
روشن ہے ترے ساتھ میری شمعِ الم بھی
بیدار و ضیا بار ہے تُو بھی ، میرا غم بھی
تُو بھی ہے لہو رنگ ،دل افگار ہیں ہم بھی
اے ہمدمِ شب! گریہ خون ناب سلامت
اے سرخ دیے تیری تب و تاب سلامت(۱۹)

فیض احمد فیض کے اس ترجمے کا مختصر جائزہ لیں تو اس بات کا بخوبی احساس ہوتا ہے کہ فیض نے اردو ترجمے کے لیے جس بلوچی نظم کا انتخاب کیا وہ ان کے آدرش کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔اس ترجمے کی دوسری بڑی خوبی فیض کا وہ مخصوص رنگِ تغزل ہے جس کی بنا پر وہ ترجمہ کو طبع زاد کے مقام پر پہنچا دیتے ہیں اور جب تک قاری کو یہ نہ بتایا جائے کہ یہ نظم ،منظوم ترجمہ ہے ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔

فیض اور میر گل خان نصیر کے فکری امتزاج کی مثالیں اس منظوم اردو ترجمے کے تناظر میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔دونوں شاعر امیدِ فردا کی بات کرتے ہیں اور جبر و استبداد کے خونی منظر کے جلد بدل جانے کی آس میں موجودہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔کلامِ فیض میں ایسے متعدد اشعار موجود ہیں جو درپیش صورت حال کا جواں مردی سے سامنا کرنا کا درس دیتے ہیں ۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوت و ہزار کا موسم(۲۰)

اگرچہ فیض کے ہاں باقاعدہ طور پر ''دیے'' کی علامت نہیں پائی جاتی لیکن ان کے ہاں بھی داغ داغ اجالے اور شب گزیدہ سحر کو صبحِ پُر نور میں بدلنے اور گرانیِ شب میں کمی لانے کی خواہش نظر آتی ہے۔نصیر نے اپنی نظم کے پہلے ،دوسرے بند میں جس منزل کے کھو جانے کا ذکر کیا ہے فیض ''صبحِ آزادی'' میں اسی منزل کے کھو جانے کی بات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اسی طرح تیسرے اور چوتھے بند میں میر گل خان نصیر اپنے دیس کے لیے ہر طرح کی بڑی سے

بڑی قربانی دینے کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔وہ چاروں طرف پھیلی تاریکی کو اجالے میں بدلنے کے لیے روغن کی جگہ اپنا لہو بھی جلانے کو تیار ہیں صرف اس خواہش کی تکمیل کے لیے کہ سوختہ تنوں کی شبِ تار اُجلی ہو جائے۔ان کے مذکورہ بند پڑھ کر فیض کا یہ شعر ذہن میں آتا ہے ۔

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن
جو ترے عارض بے رنگ کو گلنار کریں(۲۱)

نظم کے پانچویں بند میں میر گل خان نصیر نے عشاق اور دیوانوں کے چاک دل اور چاک گریباں ہونے کا ذکر کیا ہے کہ یہ حق کے پرستار ہیں جو سب کچھ سہہ کر بھی ''دیے'' کی روشنی کے گرد اس امید کے ساتھ حلقہ کیے بیٹھے ہیں کہ ایک دن تیرہ شبی کا خاتمہ ہوگا۔یہی بات فیض اپنے انداز میں یوں کہتے ہیں:

حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے(۲۲)

فیض کے اس منظوم اردو ترجمے کا اسلوبیاتی تجزیہ کیا جائے تو مذکورہ نظم میں سیاہ رنگ فضا، عدو، صدا، رستہ، نشاں، منزل کا پتا، جوِ طرب، تیرگیِ شب کے پرستار، پسِ دیوار، صبح کے آثار، رگِ جاں، دولت بیدار، سوختہ جاں، شب تار، سر صر، شب غم، تن، ضو، دل چاک، گریبان، حق کے پرستار، دیوانے، سرِ میداں، رہبر، حشر اٹھانا، تحرِ سرخ، صبحِ چمن، بیداریِ اربابِ وطن، لہو رنگ، دل افگار جیسے دیگر الفاظ و تراکیب، فیض کے شاعرانہ اسلوب کے غماز ہیں۔اسی طرح فیض کی شاعری کا نمایاں وصف اُس میں مختلف رنگوں کا بکھرا ہوا ہونا ہے۔جن میں فیض کے دو پسندیدہ رنگ بالخصوص سیاہ اور سرخ رنگ کا بہت ذکر ملتا ہے جو یہاں بھی موجود ہیں جیسے تیرگیِ شب، شب تار، سحرِ سرخ لہو رنگ وغیرہ۔

اس منظوم اردو ترجمہ کی روشنی میں بھی فیض اور میر گل خان نصیر کے فکری و فنی اماثل تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ دونوں شاعر انقلاب کی بات کرتے ہیں لیکن اپنا لہجہ رومانوی لکھتے ہیں۔شعر کا مقصد تخلیق جنگ میں الاؤ کرنا سمجھتے ہیں چنانچہ دونوں شاعر اپنے ہم سفروں کا حوصلہ بلند رکھتے ہیں اور رجائیت کا درس دیتے ہیں۔فکری ہم آہنگی کے ساتھ فنی حوالے سے کلاسیکی شاعری کے اسلوبِ شعر کو اپناتے ہیں اور جدید شعری علامتوں اور استعاروں کے بجائے مروجہ تراکیب و مرکبات کو نئے معانی و مفاہیم عطا کرتے ہیں۔مجموعی طور پر فیض کا یہ اردو ترجمہ ان کے ہمہ جہت شاعر ہونے کی نشاندہی کرتا ہے اور اس بات کی واضح دلیل بھی ہے کہ فیض کو جہاں کہیں بھی اپنے نظریے اور آدرش سے ہم آہنگ شاعری نظر آئی انھوں نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے قارئین سے متعارف کرایا۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ http://en.wikipedia.org/wiki/Gul_Khan_Nasir

۲۔ عبدالصبور، ورشہ، کوئٹہ: بلوچی اکیڈمی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۷

۳۔ محمد ہاشم غلزئی، گل خان کچھ یادیں،مشمولہ:میری گل خان نصیر:شخصیت ،شاعری اورسیاست ، (مرتب)نورمحمد، شیخ،کراچی:عوامی ادبی انجمن،۱۹۹۳ء، ص۴۷

۴۔ واحد بخش بزدار،میرگل خان نصیر:شخصیت اورفن،اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۶ء،ص ۱۹

۵۔ عبداللہ جان جمال دینی، گل خان نصیر کی شاعری،مشمولہ:میر گل خان نصیر:شخصیت ،شاعری اور سیاست (مرتب)نورمحمد، شیخ،کراچی:عوامی ادبی انجمن،۱۹۹۳ء،ص۴۴

۶۔ لال بخش رند،میر صاحب کی چند یادیں،مشمولہ:میرگل خان نصیر:شخصیت ،شاعری اورسیاست ، (مرتب)نورمحمد، شیخ،کراچی:عوامی ادبی انجمن،۱۹۹۳ء، ص ۶۳

۷۔ عبدالصبور،ورثہ،،ص۹۲

۸۔ مجاہد بریلوی،بلوچستان مسئلہ کیا ہے۔(انٹرویو-میرگل خان نصیر۱۹۷۸ء،کراچی)۱۹۸۴ء،ص۹۹

۹۔آغا محمد ناصر،بلوچستان میں اردوشاعری،کوئٹہ:کوژک پبلشرز،۲۰۰۰ء ، ص۹۸

۱۰۔ http://en.wikipedia.org/wiki/Gul_Khan_Nasir

۱۱۔ http://en.wikipedia.org/wiki/Gul_Khan_Nasir

۱۲۔ http://mirgulkhannaseer.blogspot.com/

۱۳۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،لاہور:مکتبہ کارواں ،مصورایڈیشن،س۔ن، ص ۲۰ تا ۲۲

۱۴۔ واحد بخش بزدار،میرگل خان نصیر:شخصیت اورفن، ص ۵۳

۱۵۔ میرگل خان نصیر،(دیباچہ) سیناﺋی کیچک ء،منقولہ:میرگل خان نصیر:شخصیت اورفن،مرتب:واحد بخش بزدار،ص ۱۲۸

۱۶۔لال بخش رند،میر صاحب کی چند یادیں،مشمولہ:میرگل خان نصیر:شخصیت ،شاعری اورسیاست ،ص ۷۸

۱۷۔ایضاً ،ص۷۰۔۶۹

۱۸۔ (i)http://baask.com/diwwan/index.php?topic=4788.0

(ii)شاہ محمد مری،ڈاکٹر، گل خان نصیر،کراچی: بک ٹائم اردو بازار،۲۰۱۰ء ص ۱۴۰ تا ۱۴۳

۱۹۔(i)http://www.youtube.com/watch?v=kdKZmo1FU6I&feature=channel

(ii)یہ نظم بلوچی شاعری کی نمائندہ ویب سائیٹ www.baask.com پر موجود ہے ۔اسی طرح www.youtube.com پر میرگل خان نصیر کے دوست محمد عطا شادکی زبانی پڑھی ہوئی ملتی ہے۔ جس میں بلوچی نظم میرگل خان نصیر کی آواز میں ہے ۔اس کا لنک پہلے لکھ دیا گیا ہے۔

۲۰۔فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص ۱۲۸

۲۱۔ایضاً ،ص۲۴۴

۲۲۔ایضاً ،ص۲۸۵